Date of Publication : 02-05-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 May 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 May 2014
Issue: 18, Vol.:73

۸تا۱۴/مئی ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر:۱۸، جلد نمبر:۷۳

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، محقق اور دانش ور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (مرحوم) کا یہ مقالہ چوں کہ ایک ایسے اہم موضوع کو محیط ہے جس کی اہمیت اور افادیت آج بھی قائم ہے، اس لیے اسے ہم گاہے گاہے بازخواں کے طور پر شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

گاہے گاہے باز خواں

اردو ادب اور قومی یک جہتی

پہلی قسط

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

سب سے پہلے تو میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے اس لکچر کے دینے کا شرف عطا فرمایا اور اس طرح میری عزت افزائی فرمائی۔ یہ شرف اور سعادت ہی نہیں، ایک بڑی ذمے داری بھی ہے۔ ادیب کا فرض ہے کہ وہ محبت، رواداری اور خدمت کی روح پھونکے۔ عدل، انصاف اور دردمندی کے گیت گائے، صبح کی نغمے اور امید اور مسرت کا پیغام سنائے۔ ٹیگور کے الفاظ میں تخلیقی ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ سچائی اور حسن کی تلاش سے تو پہلے خود ہی کو غرق ہونا ہوتا ہے اور پھر دیکھنا ہوتا ہے کہ شعر کی سچائی، ہوا کی صاف اور پانی جیسا لطیف ہے۔

ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ میری حیثیت ادب کے ایک طالب علم کی ہے جس کی تلاش اور طلب کی منزل ابھی ختم نہیں ہوئی، شروع ہوئی ہے۔

بہ نوز آں ابر رحمت در فشاں است

بہ ہر آپ کی اعانت سے اپنی کوشش ضرور کروں گا۔ میرے اطمینان کے لیے مولانا حالی کا یہ شعر کافی ہے:

بے قاعدہ جاتی نہ ازو خوردہ
مگر ہمت شیخ جامی ہو

مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ عالی جناب فخرالدین علی احمد صاحب مرحوم و مغفور کی یاد ان لکچروں کے ذریعے قائم کی جا رہی ہے۔ انسان کی دیواریں تو ڈھ جاتی ہیں، لیکن وہ یادگار جس کی بنیاد تخلیقی فکر اور علم پر ہو، ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ مجھے اس کی بھی خوشی ہے کہ محترمہ بیگم عابدہ احمد اس یادگار جلسے کی صدارت کر رہی ہیں، ان سے زیادہ موزوں صدر اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اردو کی محسن ہیں۔ محترم صدر و عزیز و دوستو! میرے لکچر کا عنوان ہے "اردو ادب اور قومی یکجہتی"۔ Integration دراصل سماجیاتی اصطلاح ہے اس کے معنی امتزاج کے ہیں، یعنی مختلف اجزا کو ملا کر متحد اور عام بنانا۔ اب اس میں ایک سیاسی جہت بھی شامل ہوگئی ہے، جو مہدی افادی کے الفاظ میں گول خانے میں چوکھٹی چیز اور عجیب بے قرینہ بات ہے۔ حضرت شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کشف المحجوب کے مصنف اور گیارہویں صدی عیسوی کے اکابر صوفیہ میں ہیں، لکھتے ہیں پہلے زمانے میں تصوف ایک حقیقت تھی، بغیر اصطلاح آج اصطلاح ہے بغیر حقیقت کچھ یہی حال قومی یکجہتی کا بھی ہے کہ باوجود ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے، ہم قومی یکجہتی کا وہ خوش آئند ماحول پیدا نہیں کر سکے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں رہا ہے۔ سر پی سی رے نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی جب ہمارا سیاسی انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تھا، کوئی فرق وارانہ فساد نہیں ہوا۔ آج صنعتی ترقی نے اقتصادی کشمکش کو بڑھا دیا ہے اور وہ کشمکش کبھی مذہب، کبھی زبان، کبھی ذات پات اور کبھی ملکی اور غیر ملکی شکل میں نمودار ہوتی ہے لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے وجدان، عارفوں اور صوفیوں کے عرفان اور فن کاروں کے خون جگر کی بدولت جو اتحاد پسندانہ جذبات پیدا ہوئے تھے وہ اتنے گہرے اور پُر خلوص اور دیرپا تھے کہ سیاسی آندھیوں نے ان کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ان کی آبیاری کے لیے نہ کانونسل کی ضرورت تھی اور نہ کمیٹی کی۔ اس یکجہتی کی حیثیت گلاب کے ایک پھول کی سی ہے جو اپنی خوشبو سے الگ پہچانا جاتا ہے اور جس کے لیے بہ قول مولانا آزاد بس یہ کافی ہے کہ وہ گلاب ہے۔

اردو ادب اور قومی یک جہتی اتنا بڑا موضوع ہے کہ سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔ اس لیے میں چند اشاروں پر اکتفا کروں گا۔ عقل مندوں کے لیے اشارے ہی کافی ہیں۔

پہلے تو یہ عرض کروں کہ اردو قومی یکجہتی اور سالمیت کی زندہ علامت ہے جو پانچ ماریچ کو تین بجے یا ایک وقت خاص میں وجود پذیر نہیں ہوئی بلکہ اس اتحاد پسندانہ ماحول کا نتیجہ ہے جو عہد وسطیٰ میں وظیفۂ زندگی تھا اور جس میں عارفوں کے وجدان اور شاعروں کی بصیرت اور فن کاروں اور دانش وروں کے دوراندیش سب ہی کی کارفرمائی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو ایک خاص صوبے یا علاقے میں ظہور میں نہیں آیا بلکہ جہاں جہاں اتحاد اور یگانگت کی فضا پیدا ہوئی اردو کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ اسی لیے کبھی یہ کہا گیا کہ اردو سندھ میں پیدا ہوئی، کبھی یہ کہا گیا کہ وہ دہلی پنجاب اور ہریانہ میں پیدا ہوئی۔ کبھی دکن میں اور کبھی گجرات میں۔ دراصل اردو ایک تہذیبی عمل ہے جس کے ذریعے سماج کی تہذیبی قدروں کا اعلان اور اظہار ہوا ہے اور اس کو جو دولت ورثے میں ملی ہے، وہ سر تا سر مشترکہ تہذیب اور مشترکہ روایات کی بدولت ہے۔

اردو ادب کے مطالعے سے ہندوستانی کلچر کی وحدت، وسعت، گہرائی اور گیرائی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے پُر آشوب زمانے میں بھی جب ہمارا سیاسی زوال انتہا کو پہنچ چکا تھا اور جب ہندوستانی خزانوں کے انگلستان منتقل ہونے اور زراعت و صنعت کے زوال کی وجہ سے اقتصادی بدحالی کی کچھ حد نہیں رہی تھی، اردو ادب کے آئینے میں مختلف رنگوں میں یک رنگی اور اختلافات کے باوصف یکجہتی صاف نظر آتی ہے۔

میں نے ایک موقعے پر عرض کیا تھا گنگا جمنا کی دھاریں جہاں آکر ملتی ہیں وہ صاف الگ معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ اس طرح ملی ہوئی بھی ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا مشکل ہے، یہی حال ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا ہے۔ یہاں بہت سی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، بہت سے سیاسی انقلابات رونما ہوئے، بہت سے حملہ آور فاتحانہ پرچم کے ساتھ داخل ہوئے، لیکن ان موجوں نے تہذیب اور تمدن کی مٹی کو اور زیادہ زرخیز کر دیا اور اس ملک کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے معمور کر دیا۔ اتحاد و امتزاج کا یہ سرچشمہ جو محمد جائسی سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کے میدانوں سے گزرتا ہوا برابر رواں دواں ہے، اردو اسی امتزاجی ماحول کی پروردہ ہے۔

(باقی آئندہ)

یاد رفتگاں

دوسری اور آخری قسط

پروفیسر کبیر احمد جائسی کی یاد میں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (ادب کدہ، مبراج پور، انور گنج، اعظم گڑھ) یوپی ۲۷۶۰۰۱-۱
E-mail: azmi408@gmail.com

[۳]

علی گڑھ

۱۷ اگست ۲۰۰۰ء

مکرمی سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ آپ کے دریافت کرنے پر لکھ رہا ہوں کہ مجھ کو جولائی کا ارشاد نہیں ملا ہے، اگست کا تو ابھی چھپا ہی نہ ہوگا۔

آپ مولانا مجیب اللہ صاحب سے ایک وقت مقرر کر کے روزانہ باقاعدہ ان کے پاس بیٹھ جایا کریں اور ان سے ان کے زمانے کے دارالمصنفین کے بارے میں مواد حاصل کیا کریں اور بعد میں اس کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر دیں۔ اگر مولانا راضی ہو جائیں تو آپ سوالات نہ کریں بلکہ مولانا خود ہی کتاب املا کرانا شروع کر دیں اور تعلیق و تحشیہ سب لکھا دیں۔ جب مسودہ تیار ہو جائے تو اس پر مولانا نظر ڈال کر کتاب شائع کروا دیں۔

اگر یہ کام میں کروں گا تو تعلیق کا عنصر کم اور تعلیق کا زیادہ ہوگا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ کام خود مولانا کی نگرانی میں ہو جائے۔ ان سے میرا سلام کہیے گا۔

والدعا

کبیر احمد جائسی

پس نوشت: اب سال میں ایک مضمون سے زیادہ نہیں لکھ پاتا اس کو بھی تحقیقات اسلامی والے "مار" لے جاتے ہیں۔

مولانا مرحوم نے اخیر زندگی میں اپنی خودنوشت 'نقوش زندگی' لکھنا شروع کیا تھا جس کی کئی قسطیں ماہنامہ الرشاد میں شائع ہوئیں۔ یہ سلسلہ منقطع ہونے پر جائسی صاحب نے یہ خط لکھا تھا مگر مولانا املا کرانے پر راضی نہ ہوئے بلکہ یہ فرماتے تھے صحت کے لیے دعا کرو خود ہی لکھوں گا۔ املا کرانے میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو لکھنے میں ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ مولانا صحت یاب نہ ہو سکے اور ایک ماہ مسلسل کومہ میں رہنے کے بعد ۱۲ رمئی ۲۰۰۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میری، ڈاکٹر ظفر صدیقی اور جائسی صاحب کی 'نقوش زندگی' کے مکمل ہونے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ مولانا مجیب اللہ ندوی کے صاحبزادے ڈاکٹر عبداللہ عمار نے 'نقوش زندگی' کو نامکمل ہی شائع کرایا ہے۔

[۴]

علی گڑھ

۱۱ رجون ۲۰۰۱ء

مکرمی سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ اس سے پہلے آپ کا کوئی خط مجھ کو نہیں ملا ورنہ جواب نہ دینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

آپ نے جو مضامین طلب کیے ہیں ان کے بارے میں عرض ہے کہ

۱- 'تعمیر انسانیت' لاہور کا فائل میرے پاس محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے "دارالمصنفین کے پہاڑی راستے" کی قسطیں بھیجنے سے قاصر ہوں۔ یاد پڑتا ہے کہ مولوی عبدالباری صاحب مرحوم نے دارالمصنفین میں اس کی جلدیں محفوظ کروادی تھیں وہاں دیکھ لیجیے۔

۲- 'نگار' میں مولانا عبدالسلام ندوی پر جو مضمون شائع ہوا تھا وہ دسمبر ۱۹۶۱ء کے 'ادیب' میں شامل ہے۔

۳- 'ادیب' کے تین سال کے شمارے میرے پاس ہیں۔ دو بار ان کی جلد بنوا چکا ہوں، کاغذ اتنا خستہ ہو گیا ہے کہ مزید بنوانا خطرے سے خالی نہیں۔ میں 'ادیب' کا ہر شمارہ دارالمصنفین بھیجتا رہا ہوں، آپ وہیں نظر ڈالیں آپ کو دسمبر ۱۹۶۲ء اور مارچ ۱۹۶۳ء کے شمارے ضرور مل جائیں گے۔ اگر نہ ملیں تو مطلع کریں میں جلد تو نہ کھلواؤں گا کسی سے نقل کروا کے بھیج دوں گا۔

آپ کی کتاب مل گئی ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی اللہ تعالی آپ سے مزید خدمات لے۔ آمین۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

[۵]

علی گڑھ

۱۱ر۷ر۲۰۰۱ء

محترمی سلام مسنون

مجھے آپ کے خط کا انتظار ہے۔ کیا آپ کو مطلوبہ مضامین مل گئے یا میں ان کو کسی سے نقل کروا کے بھیجوں؟ اس خط کو پاکر فوراً جواب دیجیے۔ آئندہ سے خط و کتابت اوپر دیے ہوئے پتے پر کریں۔

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

[۶]

علی گڑھ

۲۶ر۸ر۲۰۰۱ء

عزیزی دعائیں

یہ خط ایک ضرورت کے تحت لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ جلد سے جلد مطلوبہ کام کر دیں گے۔ مجھ کو اگست، ستمبر ۱۹۸۱ء کے الرشاد میں شائع ہونے والے انتظار احمد صدیقی کے مضمون "صوم دیدہ اور مطبع نولکشور" کی الکٹرواسٹیٹ کروا کر ارسال فرمائیں۔

شہاب الدین سے ملاقات ہو تو شکایت کر دیں کہ میں ان کو دو خط لکھ چکا ہوں مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا سے میرا سلام کہیں۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

پس نوشت: پچھلی یا دوسری قسط کے آخر میں نوٹ ہوگا بقیہ ص... پر بقیہ حصہ چھوٹنے نہ پائے۔

[۷]

علی گڑھ

۲ رستمبر ۲۰۰۲ء

مکرمی سلام مسنون

آپ کا ۲۳ رجولائی کا لکھا خط مجھ کو آج یعنی ۲ رستمبر کو رضی الاسلام صاحب نے لا کر دیا۔ لفافے پر علی گڑھ کی بہت صاف مہر ۲۷ رجولائی کی ہے۔ ۲۷ رجولائی سے ۲ رستمبر تک لفافہ کہاں رہا، خدا جانے۔ ۲ کو رضی الاسلام صاحب کو ملا اور انھوں نے بلا تاخیر لفافہ مجھ تک پہنچا دیا۔

وریا صاحبہ کا پتہ مجھ کو بھی نہیں معلوم۔ گجرات کے احباب کو لکھ رہا ہوں اگر معلوم ہو گیا تو مطلع کروں گا۔

آپ کا خیال درست ہے۔ گذشتہ پانچ برسوں میں میری پانچ کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہیں۔ تین پاکستان سے شائع ہوئی ہیں، دو ہندوستان سے۔ میں نے اب اپنی کتابوں کو تبصرہ کے لیے بھیجنا بند کر دیا ہے، وجہ یہ ہے کہ کم از کم ۳۰۰ روپے کی کتابیں ہوتی ہیں، تک بھیجنے میں چالیس روپیہ ڈاک خرچ لگ جاتا ہے۔ پھر آٹھ دس مہینے کے بعد آدھے صفحے کی جو "تبرائی" پڑھنے کو ملتی ہے اس سے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں کسی رسالے کو تبصرے کے لیے کتابیں نہیں بھیجتا۔ آپ کی اطلاع کے لیے لکھ دوں میری ایک کتاب "حافظ شخص اور شاعر" آٹھ نو مہینے سے معارف میں تبصرے کے لیے پڑی ہوئی ہے مگر آج تک تبصرہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب میں نے نہیں ناشر نے تبصرے کے لیے بھیجی تھی اس لیے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔

مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا مجیب اللہ ندوی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے بہت سارے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کو دھیرے دھیرے نقل کر کے مرتب کرنے کا خیال ہے۔ اگر یہ کام ہو گیا تو ایک عبرت ناک تاریخ دنیا کے سامنے آ جائے گی۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

راقم نے سہ ماہی 'فکر و نظر' علی گڑھ میں مولانا سید ابوظفر ندوی سابق رفیق دارالمصنفین پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جائسی صاحب نے اس پر استدراک لکھا ہے اس میں انھوں نے ابوظفر صاحب سے متعلق چند نئی باتیں لکھی تھیں۔ اس میں مولانا کی بعض تحریروں کا بھی ذکر تھا۔ راقم نے اس کی تفصیل کے لیے جو خط لکھا تھا جائسی صاحب کا مذکورہ خط اسی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس خط میں عبرت ناک تاریخ کا معاملہ یہ ہے کہ دارالمصنفین کے رفقا و نظما کے درمیان جو اندرونی چپقلش اور تنازعات ہوتے تھے اس کی تفصیل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کے اختلافات، مولانا سید ریاست علی ندوی اور مولانا مجیب اللہ ندوی کی دارالمصنفین سے علاحدگی وغیرہ۔

[۸]

ساجدہ منزل، اقرا کالونی

نیو سر سید نگر، علی گڑھ

گرامی منزلت سلام مسنون

تقریباً ایک دو ماہ قبل میں نے اپنی کتاب "ڈھونڈو گے انھیں" کا ایک نسخہ اور آپ کے نام ایک خط دستی بھیجا تھا۔ یہ دونوں چیزیں لے جانے والے صاحب سرائے میر کے ایک صاحب کو دے آئے تھے کہ آپ کو بھجوا دیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرا خط اور کتاب آپ کو ملی یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ مئی کے بعد الرشاد شائع ہوا ہے یا نہیں؟

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

دوسری قسط

علامہ اقبالؔ کا تصورِ تقدیر

پروفیسر محمد منور

سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا آسان کام نہیں۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ وہی افراد کر سکتے ہیں جن کی ذات میں توحید موجود ہے۔ منتشر شخصیت کے مالک افراد "کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے" کی اذیت ناک کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ فیصلہ ایک طرح کا اثبات خودی ہے اور حضرت علامہ کے الفاظ میں "...خودی کا اظہار اس وحدت میں ہوتا ہے جسے ہم کیفیت نفسی کی وحدت کہتے ہیں۔" "کیفیت نفسی کی" یوں کہیے کہ شخصیت کی یہ توحید یہ وحدت ذات کو میسر نہیں آتی، یہ جوہر ہدف و اہر سے خیرات و عطیے کے طور پر ملنے والی شے نہیں۔ یہ قول کہ Unity is achieved not given (توحید ذات کوشش کر کے حاصل کرنی پڑتی ہے یوں ہی نہیں مل جاتی)۔ سقراط نے کہا تھا "Know thyself" (عرفان ذات حاصل کرو)، یہ بھی کہا Choose thyself (انتخاب ذات کرو)، جس کا مطلب ہے کہ تم کس حیثیت میں زندگی بسر کرنا چاہتے ہو، کیا بننا چاہتے ہو، وہی تمہاری منزل مقصود ہے۔ حضرت علامہ اسی فیصلے کو انتخاب تقدیر کہتے ہیں۔ وہ ان کی تقدیر اختیار کرنا چاہتے ہو [illegible] اس لیے ضروری ہے کہ آدم میں تکوین ذات کا امکان موجود ہے۔ جہاں وہ یہ جان سکتا ہے کہ وہ کیا ہے، وہاں وہ یہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ اسے کیا ہونا چاہیے۔ چناں چہ اس کی تکوین لحظہ بہ لحظہ عمل میں آتی رہتی ہے۔ کچھ حالتیں مرتی جاتی ہیں، کچھ حالتیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کچھ شخصیت پیچھے رہ جاتی ہے کچھ آگے بڑھ جاتی ہے۔ خود حضرت علامہ کے الفاظ میں "ہماری تکوین کی صورت ہی یہ ہے کہ ہم وہ کچھ نہ رہیں جو ہیں۔ زندگی کا راستہ گویا موت در موت سے گزرتا ہے۔"[۲۱]

شخصیت کی ارادی تعمیر یا انتخاب تقدیر کا مضمون حضرت علامہ کے کلام میں بارہا جلوے دکھاتا ہے اور اسرار خودی کی منزل سے لے کر بانگ درا کے تیسرے حصے کے متوازی ہے۔ کلام کے بالکل آخری حصے تک اس عقیدے میں ضعف نہ آیا، اس کے اثبات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تقدیر کے انتخاب کا یہ مضمون اسرار خودی کے ابتدائی صفحات ہی میں جلوہ دکھانے لگ گیا تھا، مثلاً:

قطرۂ شبنم سر شاخ گلے
تافت مثل اشک چشم بلبلے
مرغ مضطر زیر شاخ گل رسید
در دہانش قطرۂ شبنم چکید
چوں ز سوز تشنگی طائر گداخت
از حیات دیگرے سرمایہ ساخت
غافل از حفظ خودی یکدم مشو
ریزۂ الماس شو شبنم مشو[۲۳]

"ایک قطرۂ شبنم پھول کی ایک ٹہنی کی نوک پر بلبل کی آنکھ کے آنسو کی طرح چمک رہا تھا۔ پیاس کے ہاتھوں بے بس ایک پرندہ اس ٹہنی کے نیچے پہنچا اور وہ قطرۂ شبنم اس کے منہ میں ٹپک پڑا۔ ظاہر ہے کہ جب اس پرندے کو پیاس کی تپش نے جلایا تو اس نے دوسرے کے وجود کو اپنے لیے سرمایۂ حیات بنالیا۔ لہٰذا تجھے خودی کے پاس سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ تجھے قطرۂ شبنم ہرگز نہیں بننا چاہیے۔ تجھے ریزۂ الماس کی طرح رہنا چاہیے"۔ مطلب یہ کہ حفظ خودی سے غفلت ضعف کا باعث ہوتی ہے اور پھر ضعف کسی صاحب قوت کی حرص و آز کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ اسی مضمون کو "بال جبریل" کی نظم "ابوالعلا معری" میں واضح کیا گیا ہے:

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معری
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوان تر و تازہ معری نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحب غفران و لزومات
اے مرغک بیچارہ! ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات[۲۴]

اب یہ تو ظاہر ہے کہ تیتر کو تیتر ہی رہنا ہے، وہ شاہین نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف آدمی کے سمجھنے کی بات ہے۔ پرندے کے پاس تو اختیار و انتخاب کا ملکہ موجود نہیں۔ آدمی کے پاس یہ ملکہ موجود ہے لہٰذا یہ تیتر اور شاہین کے درجات کا فرق آدمی کے لیے عبرت ہے تاکہ آدمی فیصلہ کر سکے کہ اسے ضعیف بن کر رہنا ہے یا قوی ہو کر۔ "جاوید نامہ" میں بھی یہ تلقین موجود ہے اور انتخاب تقدیر کے باب میں حرف کی باتیں کہی گئی ہیں:

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر
خواہ از حق حکم تقدیر دگر
تو اگر تقدیر نو خواہی رواست
زانکہ تقدیرات حق لاانتہاست
رمز باریکش بحرفے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است!
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست
قلزمی؟ پایندگی تقدیر تست!
خاک شو نذر ہوا سازد ترا
سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا[۲۵]

"اگر ایک تقدیر سے تمہارا جی جلتا ہے تو اسے ترک کر دو اور اللہ سے دوسری تقدیر طلب کرو۔ تمہارا نئی تقدیر طلب کرنا بالکل جائز ہے، اس لیے کہ اللہ کی تقدیریں لاانتہا ہیں۔ تقدیر کے باب میں باریک سی رمز یہ ہے کہ تم بدل جاؤ تو وہ بھی بدل جاتی ہے۔ چناں چہ اگر تم شبنم ہو گے تو گرنا (ٹپک جانا) تمہاری تقدیر ہے اور اگر تم قلزم ہو تو تمہاری تقدیر ہے پائندہ رہنا۔ خاک ہو گے تو تقدیر ہوا کے حوالے کر دے گی۔ سنگ ہو گے تو یہ تقدیر تمہیں شیشوں پر پھینک دے گی۔"

لیکن اس تلقین میں کہا یہ گیا ہے کہ نئی تقدیر کا حکم یعنی فیصلہ خدا سے طلب کرنا ہوگا۔ اللہ کے حضور دعا کرنا ہوگی تاکہ وہ نئی تقدیر کے اختیار کی توفیق دے اور صحیح تقدیر کی راہ پر ڈالے اور ہمت عطا فرمائے تاکہ بہتر سے بہتر تقدیر کی طرف رستہ کھلتا چلا جائے۔ تقدیرات کی تماشا گاہ تو آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہاں خاک کے ذرے بھی ہیں اور چٹانیں بھی، شیشے بھی ہیں، پہاڑ بھی، قطرے بھی ہیں سمندر بھی، چشمے بھی ہیں اور طوفان بھی، تیتر بھی ہیں اور شاہین بھی، گیدڑ بھی ہیں اور شیر بھی، غلام بھی ہیں اور آزاد بھی، حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔ اور خالق تقدیر جاننا چاہتا ہے کہ تم کس تقدیر کے طلب گار ہو۔

آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مفاجات[۲۶]

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟[۲۷]

مگر یہ انتخاب تقدیر یا حتمی پسند و ناپسند پر قدرت کا مرحلہ آسانی سے نہیں آ جاتا۔ آدمی کی ہستی روح بھی ہے اور مادہ بھی۔ روح اللہ سے احکام حاصل کرتی ہے، مادہ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ روح لطیف ہے، مادہ کثیف ہے، مادے کی کارفرمائی کے لیے گنجائش بہت زیادہ ہے۔ آدمی کے اندر یہ روح والا حصہ 'عالم امر' کہلاتا ہے، مادی حصے کو 'عالم خلق' کہتے ہیں۔ عالم امر اس رعایت سے بھی عالم امر کہلاتا ہے کہ ارشاد ربانی ہے: قل الروح من امر ربی (اے رسول کہہ دیں کہ روح میرے رب کا ایک امر ہے)۔ ہوس کے جملہ شعبے جن کی نمائندگی صفت حرص بھی کرتی ہے، انسان کے مادی وجود یعنی عالم خلق سے متعلق ہے۔ ہوس کے درجات سے بلند شعبے جن کی نمائندگی صفت 'ایثار' کرتی ہے 'عالم امر' سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی بندۂ خدا حرص کا غلام ہے تو یہ تعجب کا مقام نہیں۔ اس لیے کہ ہے کوٹلے ہی کی طرف کشش ہوتی ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص ایثار کی زندگی گزارتا ہے، فیاض ہے، ہمدرد ہے، خادم خلق ہے، صاحب ایثار ہے اور ہوس کے بندھنوں میں بندھا ہوا نہیں اور حرص و آز کے زندان سے آزاد ہے تو پھر مقام تعجب ہے اور ایسا شخص لائق داد و تحسین ہے۔ اس لیے

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اگر افراد معاشرہ اپنی جگہ پست ہمت اور کج بیں ہیں تو پورا معاشرہ پست ہمت اور کج بیں ہوگا۔ چناں چہ انفرادی نکبت اور اجتماعی نکبت میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ افراد کا رویہ کچھ اور ہو اور پورے معاشرے کا انداز کچھ اور ہو۔ تقریباً ایک ہی رویہ ہر شعبے میں کام کرتا ہے اور اسی عادی رویے کے مطابق اس معاشرے کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ اگر اکثریت معیاری افراد کی ہو تو اس میں ایک تعداد غیر معیاری افراد کی بھی کھپ جائے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کے افراد کا حاوی عنصر زوال پذیر اور غیر معیاری ہو اور وہ قلیل تعداد کے قابل اور اہل افراد کے باعث فطرت کی جانب سے عائد کردہ اصولی سزا اور عقوبت سے بچ جائے۔

اردو دُنیا

محکمہ السنہ میں 'اردو آفیسر' کا کام بھی 'ہندی آفیسر' کے سپرد

دہلی اردو موومنٹ کا لیفٹننٹ گورنر سے اردو آفیسر کی تقرری کا مطالبہ

نئی دہلی (۱۹ راپریل)۔ دہلی سرکار اردو کے لیے کس حد تک سنجیدہ ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ دہلی سرکار کے محکمۂ السنہ میں اردو آفیسر کا کام بھی ہندی آفیسر کے ذریعے انجام دیا جارہا ہے جب کہ وہ اردو سے قطعی ناواقف ہیں۔ اس سلسلے میں دہلی اردو موومنٹ نے لیفٹننٹ گورنر نجیب جنگ سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو آفیسر کے عہدے پر کسی اردو والے کی تقرری کی جائے۔ واضح ہو کہ دہلی سرکار کے محکمۂ السنہ میں اردو آفیسر اشفاق عارفی کا تبادلہ جنوری میں اوقاف سکریٹریٹ میں انڈر سکریٹری اسمبلی کے طور پر کردیا گیا تھا، لیکن ان کے تبادلے کے بعد اردو آفیسر کے عہدے پر کوئی نئی تقرری نہیں کی گئی اور اردو محکمہ کا کام بھی ہندی آفیسر سریش شرما کو سونپ دیا گیا جب کہ سریش شرما اردو سے ناواقف ہیں۔ اس سلسلے میں دہلی اردو موومنٹ کے کنوینر فرید احمد نے لیفٹننٹ گورنر سے مطالبہ کیا ہے کہ اس عہدے پر کسی اردو جاننے والے افسر کی تقرری کی جائے۔ مطالبے میں کہا گیا ہے کہ اگر اس عہدے پر فوری طور سے نئی تقرری ممکن نہیں ہے تو کسی اور محکمے سے اردو جاننے والے افسر کو یہاں تعینات کیا جاسکتا ہے تاکہ کم سے کم اردو محکمے کا کام تو عمدہ سے جاری رہ سکے۔ واضح ہو کہ اردو آفیسر کے عہدے پر دہلی سرکار کے جنرل ایڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ کے ذریعے سیدھا تقرر ہوتا ہے اور اس کے لیے یو پی ایس سی سے اسامی پُر کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اشتہار دے کر آگے کی کارروائی مکمل کی جاتی ہے۔ چار بار اشتہار دینے پر بھی اگر کوئی امیدوار نہیں ملتا تو اس عہدے پر کسی کو ڈیپوٹیشن پر لایا جاتا ہے۔ ذرائع کا کہنا ہے کہ چوں کہ ابھی انتخابی ضابطۂ اخلاق نافذ ہے اس لیے اس تعلق سے کوئی کارروائی شروع ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ۱۶ رمئی کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے جانے کی امید ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو میڈیم کی نصابی کتابیں بازار میں دستیاب نہیں

بورڈ کے امتحانات دینے والے طلبہ سخت پریشانی سے دوچار

نئی دہلی (۱۶ راپریل)۔ دہلی میں نیا تعلیمی سیشن یکم اپریل سے شروع ہوچکا ہے لیکن ابھی تک بازار میں اردو میڈیم کی بہت سی نصابی کتابیں ہی نہیں پہنچی ہیں جس کی وجہ سے طلبہ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، خاص طور سے بارہویں جماعت کے طلبہ کو زیادہ پریشانی ہے کیوں کہ انھیں بورڈ کا امتحان دینا ہے۔

دہلی میں اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ کے لیے اردو میڈیم کی کتابوں کو تقسیم کرنے کا کام اردو اکادمی کے پاس ہے۔ اردو اکادمی یہ کتابیں دکان داروں کو فراہم کراتی ہے جہاں سے طلبہ نصابی کتابوں کی خریداری کرتے ہیں۔ ہر سال اپریل اور مئی میں اردو میڈیم کی کتابوں کی قلت پیش آتی ہے لیکن ان سے کوئی سبق نہیں لیا جاتا اور کتابوں کی اشاعت کرنے والی این سی ای آر ٹی اور ایس سی ای آر ٹی بھی کتاب کا ترجمہ نہ ہوپانے، کبھی اشاعت میں دیر ہوجانے جیسی مختلف وجوہ کی بنا پر نصابی کتابیں فراہم کرانے میں تاخیر کردیتی ہیں، جس کا خمیازہ طلبہ کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس بار بھی نیا تعلیمی سیشن شروع ہوئے دو ہفتے گزر چکے ہیں لیکن ابھی کافی کتابیں بازار میں نہیں آئی ہیں۔ اردو میڈیم کی کتابیں فروخت کرنے والے بک ڈپو سے بات چیت کے بعد یہ تفصیل سامنے آئی ہے کہ ابھی بارہویں جماعت کی ہسٹری (فرسٹ اور سیکنڈ) اور پولیٹکل سائنس کی کتابیں طلبہ کو نہیں مل رہی ہیں۔ دسویں جماعت کی جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے۔ نویں جماعت کی گلزار اردو، جغرافیہ، ریاضی اور تاریخ، چھٹی جماعت کی جغرافیہ اور چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کی اردو گلدستہ بازار میں نہیں ہے۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' نے اس سلسلے میں دہلی میں اردو کی نصابی کتابوں کی تقسیم کار ایجنسی اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس بار اردو کی تقریباً تمام نصابی کتابیں دستیاب ہیں اور اکادمی نے ۳۱ رمارچ تک سات لاکھ روپے کی کتابیں سیل کی ہیں اور ۳۱ رمارچ تک تمام کتابیں موجود تھیں۔ اس کے بعد اکثر اسٹاف الیکشن ڈیوٹی پر لگ گیا جس کی وجہ سے اس کے بعد کتابوں کی نئی کھیپ نہیں آپائی ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ یہ تمام کتابیں اگلے ہفتے سے پھر مہیا ہوں گی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

دہلی اردو اکادمی کے زیر التوا پروگرام مئی میں

نئی دہلی (۱۶ راپریل)۔ پہلے دہلی الیکشن پھر بجٹ اور گرانٹ کا انتظار اور پھر لوک سبھا الیکشن کے سبب ضابطۂ اخلاق کے نفاذ کی وجہ سے دہلی اردو اکادمی میں پروگراموں کے انعقاد کے تعلق سے جاری جمود ٹوٹنے کے فی الحال کوئی آثار نہیں ہیں اور اب جو بھی کچھ ہوتا ہے وہ ۱۶ رمئی کے بعد ہی ہوگا۔ انتخابی ضابطۂ اخلاق نافذ ہونے کے سبب اکادمی کے تمام بڑے پروگرام جن میں تقریب تقسیم ایوارڈ، طلبہ کو انعامات کی تقسیم اور نئے پرانے چراغ وغیرہ نہیں ہوسکے۔ عام طور سے یہ تمام پروگرام فروری اور مارچ میں ہوتے ہیں۔ اب جب کہ دہلی میں الیکشن ہوچکا ہے تو ان پروگراموں کے انعقاد کے تعلق سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں اردو اکادمی کے پروگرام آفیسر محمد راغب نے بتایا کہ ابھی الیکشن کا عمل مکمل نہیں ہوا ہے اور ضابطۂ اخلاق نافذ ہے اس لیے اب جو بھی ہوگا وہ ۱۶ رمئی کے بعد ہی ہوگا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو میڈیم اسکولوں میں 'نان اردو' اسٹاف کیسے؟

دہلی ہائی کورٹ کا سوال، محکمۂ تعلیم کو حلف نامہ داخل کرنے کا حکم

نئی دہلی (۲۳ راپریل)۔ دہلی ہائی کورٹ نے راجدھانی کے اردو میڈیم اسکولوں میں اردو سبجیکٹ کے ٹیچرز کی بحالی میں مسلسل کی جارہی ٹال مٹول پر سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے دہلی سرکار کے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کو ایک حلف نامہ داخل کرکے یہ بتانے کی ہدایت دی ہے کہ آخر اردو میڈیم اسکولوں میں اتنا نان اردو اسٹاف کیسے ہوگیا اور اس نے ۱۹۹۵ء سے قبل کن رولز کی بنیاد پر اردو ٹیچرز کا تقرر کیا تھا۔ عدالت نے اس کے لیے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کو چھ ہفتے کا وقت دیا ہے۔

چیف جسٹس محترمہ روہنی اور جسٹس پردیپ نندراجوگ کی بنچ نے اس معاملے کی سماعت کرتے ہوئے سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن کو بھی فریق کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ بنچ کے سامنے آج سینئر ایڈووکیٹ مشتاق احمد نے بحث کرتے ہوئے بتایا کہ دہلی سرکار کا محکمۂ تعلیم اردو سبجیکٹ ٹیچر کی ایک دو بحالی کرکے عوام اور عدالت کو گمراہ کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ انھوں نے عدالت کو بتایا کہ اردو سبجیکٹ ٹیچرز کی ۱۹۹۵ء سے ایک بھی بحالی نہیں کی گئی ہے جس کی وجہ سے دہلی میں اردو میڈیم اسکول ختم ہوگئے اور کئی کو دوسرے اسکولوں میں ضم کرنا پڑا۔ انھوں نے بتایا کہ اب جو اسکول باقی بچے ہیں وہ بھی بند ہونے کے دہانے پر ہیں۔ مشتاق احمد نے عدالت کے سامنے ایک فہرست پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس وقت اردو میڈیم اسکولوں کا 'نان اردو' اسٹاف (۸۰) فیصد سے زیادہ ہے۔ محکمۂ تعلیم کہتا ہے کہ ان کے پاس ریکروٹمنٹ رولز نہیں ہیں تو تقرری کیسے کریں؟ اس پر عدالت نے سخت تیور اختیار کرتے ہوئے دہلی سرکار اور اس کے محکمۂ تعلیم کو حکم دیا ہے کہ وہ تفصیلی حلف نامہ عدالت میں پیش کرے اور اس بات کی وضاحت کرے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں اردو سے ناواقف اسٹاف (۸۰) فیصد سے زیادہ کیسے ہوگیا؟ اور محکمہ نے ۱۹۹۵ء سے قبل اردو ٹیچرز کی بحالی کس بنیاد پر کی تھی۔

عدالت نے سخت رویہ اپناتے ہوئے محکمۂ تعلیم سے کہا کہ آخر آپ اس معاملے کو کیوں لٹکا رہے ہیں جب کہ آئین کی دفعہ 350A اور دہلی اسکول ایجوکیشن ایکٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں ہی دی جائے گی۔ پھر آخر آپ اردو ٹیچرز کی بحالی کیوں نہیں کررہے۔ عدالت نے محکمۂ تعلیم کو ہدایت دی ہے کہ وہ (۶) ہفتے کے اندر اپنا تفصیلی حلف نامہ داخل کرے۔

واضح رہے کہ دہلی ہائی کورٹ کی بنچ نے سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی اس معاملے میں بطور فریق شامل کیے جانے کی درخواست کو قبول کرلیا۔ اب تک یہ مقدمہ گذشتہ سیوا کمیٹی اور چند ایجوکیشن سوسائٹی لڑ رہی تھی۔ انھوں نے اپنی پٹیشن میں کہا تھا کہ دہلی سرکار کے محکمۂ تعلیم نے ۱۹۹۵ء کے بعد سے ایک بھی اردو سبجیکٹ ٹیچر کا تقرر نہیں کیا جس کی وجہ سے نہ صرف اردو میڈیم اسکول بند ہورہے ہیں بلکہ اردو طلبہ کا مستقبل بھی تاریک ہورہا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

سیکولرازم اردو کی پالیسی نہیں بلکہ اس کا عقیدہ ہے

پراچین کلا کیندر چنڈی گڑھ کی طرف سے جموں میں کل ہند مشاعرہ منعقد

جموں (پریس ریلیز)۔ پراچین کلا کیندر چنڈی گڑھ کی طرف سے گزشتہ دنوں جموں کلب جموں میں ایک کل ہند اردو مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مشہور شعرا نے حصہ لیا۔ یہ مشاعرہ ایم. ایل. کوسر جو پراچین کلا کیندر چنڈی گڑھ کے بانی تھے، انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت جناب جاوید رینا (ڈپٹی چیرمین لیجسلیٹو کونسل) نے کی جب کہ جناب شکیل سوتی (رجسٹرار جج الہ آباد ہائی کورٹ) مہمان خصوصی تھے۔ اس مشاعرے کی نظامت کے فرائض جناب شمس تبریزی نے انجام دیے۔ جناب چمن لال چمن (سابق وزیر حکومت جموں وکشمیر) مہمان ذی وقار تھے۔ مشاعرے کی ابتدا میں ممتاز ادیب جناب آنند لہر جو کلا کیندر کے سینئر وائس چیرمین ہیں، نے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ اردو عام لوگوں کی زبان ہے اور اس نے ہر دور میں سیکولرازم کو پروان چڑھایا

اردو اساتذہ اور اسٹاف کا فوری طور سے بندوبست کیا جائے

این جی او کی شکایت پر قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کی ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کو ہدایت

نئی دہلی (۲۳ اپریل)۔ قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی نے دہلی سرکار کے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کو ہدایت دی ہے کہ وہ دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں میں اردو اسٹاف کا فوری طور سے بندوبست کرائے خصوصاً شمال مشرقی دہلی کے زینت محل گرلز سینئر سیکنڈری اسکول جعفرآباد اور قریش نگر واقع گورنمنٹ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول میں ۷۸ فیصد ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ اسٹاف غیر اردو داں ہے، ان میں اسکول کے پرنسپل بھی شامل ہیں۔ قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کی اس ہدایت کے بعد ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن شمال مشرقی دہلی اور ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن شمالی دہلی کو سرکلر جاری کرکے کہا ہے کہ وہ مذکورہ بالا دونوں اسکولوں میں اردو اسٹاف کی تقرری کے لیے قدم اٹھائیں اور اس کے لیے دہلی اردو اکادمی کا تعاون حاصل کریں۔

ایجوکیشن ڈائرکٹر کی اس ہدایت کے بعد ابھی ڈپٹی ڈائرکٹر ایجوکیشن نارتھ ایسٹ اور نارتھ کی جانب سے کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی ہے۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا نے اس سلسلے میں اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ ابھی تک اس سلسلے میں محکمہ تعلیم کی جانب سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا گیا ہے اور اگر کیا بھی جاتا تو اردو اکادمی اس معاملے میں ان کے ساتھ کوئی تعاون کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت اردو اکادمی کے پاس صرف ۱۱۹ اردو اساتذہ ہیں جو سب ہی کسی نہ کسی اسکول میں پڑھا رہے ہیں۔ ایسے میں اگر محکمہ تعلیم ان سے اردو اساتذہ مہیا کرانے کو کہتا ہے تو اس کے لیے خصوصی حکم کے تحت اردو اساتذہ کا کنٹریکٹ پر تقرر کیا جاسکتا ہے لیکن اس عمل کو بھی پورا کرنے میں کم سے کم دو تین ماہ لگ جائیں گے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو کے معاملے میں کسی بھی سیاسی پارٹی کے امیدوار کی نیت صاف نہیں

جونپور (یکم اپریل)۔ جونپور ضلع میں ان دنوں انتخاب کا خمار ہر کسی کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس میں سیاسی لیڈران ہوں یا عوام، ہر کوئی اپنے امیدواروں کی جیت کے لیے کوشاں ہے اور ان سیاسی لیڈران کی زبانیں جہاں اس وقت شیریں ہوتی ہیں وہیں ان کی نظر میں اقلیتوں کا ووٹ جیتنا ان کی کامیابی کا راز سمجھا جارہا ہے اور ہر سیاسی لیڈر جب اقلیتوں کے علاقے میں پہنچتا ہے تو وہ خود کو ان کا ہمدرد اور ان کی لڑائی لڑنے والا بتاتا ہے لیکن معاملہ اگر زمینی سطح پر دیکھا جائے تو بالکل مختلف ہے۔ اردو زبان کا حق دلانے کا دعویٰ کرنے والے ان سیاسی امیدواروں کے گھر پر نہ تو کوئی اردو اخبار آتا ہے اور نہ ہی یہ لوگ کسی اردو اخبار میں اپنی تشہیر ہی کرواتے ہیں۔ ہاں اگر خدانخواستہ بھی کسی اردو اخبار والے کو یہ موقع دے بھی دیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے اردو اخبار کے اوپر نہیں بلکہ پوری قوم پر احسان کیا ہو۔ اس سے ان کی ہمدردی کا جہاں ایک جانب اندازہ لگ جاتا ہے وہیں ان کی اقلیت نوازی بھی سامنے آجاتی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ یہ سیاسی لیڈران ہندی اخبارات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ہر سیاسی لیڈر جب کوئی پروگرام کرتا ہے تو جہاں وہ ایک جانب ہندی اخباروں کا سہارا لیتا ہے وہیں اردو اخبارات کا بھی سہارا ضرور لیتا ہے لیکن جب اردو والوں کو ان کے حق دینے کی بات آتی ہے تو [illegible]۔

(انقلاب، دہلی)

ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو سیکولرزم کی پالیسی نہیں بلکہ عقیدہ ہے۔ جناب مشتاق صدف نے کیندر کی ادبی خدمات کی سراہنا کی اور امید ظاہر کی کہ مستقبل میں بھی کیندر اس نوعیت کے مشاعرے منعقد کرے گا۔ جن شعرا حضرات نے مشاعرے میں شرکت فرمائی ان کے اسمائے گرامی ہیں: جناب حق کانپوری، نسیم راشد، محسن تبریزی، مشتاق صدف، احسن عمروہی، کشش وارثی، معین شاداب، ڈاکٹر ضیا ٹونکی، جناب شیخ نظامی، محترمہ ذہینت مرادآبادی، محترمہ ساجدہ حقانی، جناب زبیر بانکوی، ڈاکٹر نعیم قیصر، سرور ساجد، وشال بھارتی، راشد انور راشد، محترمہ افشاں ملک، جاوید انور اور جناب رؤف شمر۔

آندھرا پردیش میں اردو زبان سے تعصب

حیدرآباد۔ حکومت آندھرا پردیش نے ۲۳ رجون ۲۰۱۲ء کو GO(R) No. 3120 جاری کرتے ہوئے ہدایت دی تھی کہ جن علاقوں میں 20 فیصد سے زائد رائے دہندگان ہوں وہاں ان کی مادری زبان میں انتخابی قواعد کو شائع کیا جائے۔ واضح رہے کہ اردو زبان ریاست آندھرا پردیش کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ اس زبان کے ساتھ محکمہ جاتی سطح پر ناانصافیوں کی شکایتیں عام ہیں۔ حکومت نے خاص طور پر اردو زبان میں انتخابی قواعد اور ووٹر لسٹ شائع کرنے کے لیے M/S CMC Ltd کو 40 لاکھ 45 ہزار 650 روپے جاری کیے تاکہ اردو ٹرانسلیشن سافٹ ویئر کے ذریعے اردو زبان میں انتخابی قواعد و ضوابط کو شائع کیا جاسکے، لیکن صرف انگریزی اور تلگو زبان میں ہی انتخابات سے متعلق مواد شائع کیا گیا۔ سی ایم سی کمپنی نے اپنی ذمہ داری سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے مبینہ طور پر 40 لاکھ روپے کی رقم ہڑپ کرلینے کا انکشاف ہوا ہے۔ اس طرح اس اسکام میں ملوث کمپنی کے ذمہ داروں کے خلاف قانونی کارروائی ضروری ہے۔ ریاستی گورنر اور الیکشن کمیشن کو اس ضمن میں اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے کمپنی کے خلاف کارروائی کرنی چاہیے۔

(رہنمائے عوام، حیدرآباد)

اردو میڈیم مدارس کو بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لیے رقمی امداد

حیدرآباد۔ ریاست کے 1028 اردو میڈیم مدارس کو 10 کروڑ 16 لاکھ 13 ہزار روپے انفرااسٹرکچر اور سہولتوں کو بہتر بنانے کے لیے دیے گئے۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے سرکاری اور ایڈیڈ اردو میڈیم پرائمری، اپر پرائمری اور ہائی اسکولوں میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی اور انفرااسٹرکچر کو بہتر بنانے کے لیے اسکول کے ذمہ داروں کو چیکس حوالے کرنے کی ایک تقریب حج ہاؤس نامپلی میں منعقد ہوئی۔ اسپیشل سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود جناب سید عمر جلیل (آئی اے ایس) کے ہاتھوں اسکولوں کے ہیڈ ماسٹرس اور ذمہ داروں میں چیکس تقسیم کیے گئے۔ اس موقع پر کمشنر اقلیتی بہبود جناب شیخ محمد اقبال (آئی پی ایس) اور ڈاکٹر ایس اے شکور (سکریٹری اردو اکیڈمی) بھی موجود تھے۔ جناب عمر جلیل نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو مدارس میں انفرااسٹرکچر اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لیے ہائی اسکول کو 25 ہزار اور اپر پرائمری کو 20 ہزار نہایت ناکافی ہے۔ آئندہ مالی سال میں وہ اسے دوگنا کرنے کی سفارش کریں گے۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے جو اقدام کیے جارہے ہیں وہ خوش آئند ہیں۔ ریاست بھر میں تقریباً تین ہزار اردو میڈیم اسکول موجود ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک ہزار 28 اسکولوں کو معمولی فنڈس فراہم کیے جارہے ہیں، اس سے صرف الماری یا چند چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ سال اردو اکیڈمی کے علاوہ وقف بورڈ بھی اگر منسلک ہوجائے تو بورڈ بھی اردو مدارس کی سرپرستی کرے گا۔ انھوں نے بتایا کہ محکمہ اقلیتی بہبود کے لیے 1027 کروڑ روپے کا جو بجٹ مختص کیا گیا تھا اس میں سے 750 کروڑ روپے جاری کیے گئے ہیں جن میں سے 475 کروڑ روپے خرچ ہوچکے ہیں۔ جناب عمر جلیل نے اردو مدارس کے ذمہ داران پر زور دیا کہ وہ اردو میڈیم مدارس میں کامیابی کے فیصد میں خاطر خواہ اضافے کے لیے کام کریں۔ انھوں نے بتایا کہ اردو میڈیم مدارس میں دسویں میں کامیابی 61 فیصد بتائی گئی ہے۔ انھوں نے اسے 90 فیصد میں تبدیل کرنے پر زور دیا۔ اردو میڈیم کی کتابیں جو تلگو اکیڈمی کی جانب سے شائع کی جارہی ہیں، اگر اردو اکیڈمی دسویں اور انٹر کی کتابیں شائع کرکے طلبہ کو وقت پر فراہم کرے تو طلبہ کی کامیابی کے فیصد میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔ جناب شیخ محمد اقبال (کمشنر اقلیتی بہبود) نے کہا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں انفرااسٹرکچر کی کمی ہے، عام طور پر بنیادی سہولتیں دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ پروفیسر ایس اے شکور (سکریٹری آندھرا پردیش اردو اکیڈمی) نے کہا کہ اکیڈمی کی تقریباً تمام اسکیموں پر جاریہ سال عمل آوری ہوچکی ہے، صرف مخدوم ایوارڈ تقریب کا انعقاد باقی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے تین ہزار اردو مدارس میں سے صرف 1433 مدارس نے درخواستیں داخل کی تھیں، متعلقہ ڈی ای اوز کے ذریعے فارم جاری کیے گئے تھے۔ متعلقہ اسکولوں کے ذمہ داروں کو جو چیکس دیے جارہے ہیں اس کے اخراجات کی تفصیلات متعلقہ ڈی ای او سے حاصل کی جائیں گی۔ اردو اکیڈمی کی جانب سے انٹر سال دوم کی نصابی کتب پہلی مرتبہ شائع کی گئی ہیں۔ مزید نصابی کتب کی اشاعت کے ذریعے اردو زبان و ادب کی ترقی کے اقدام کیے جائیں گے۔

(اعتماد، حیدرآباد)

رفتید ولے نہ از دل ما

آسنسول، مغربی بنگال کے مشہور ڈرامہ نگار جناب صلاح الدین تاج کا ۹ اپریل ۲۰۱۴ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا، وہ تقریباً 57 برس کے تھے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے صباح الدین، اصلاح الدین اور چار بیٹیاں شامل ہیں۔ ۱۰ اپریل کو بعد نماز عصر گلی کے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کردیا گیا۔ نماز جنازہ گلی کے مدنی مسجد کے خطیب و امام مولانا حافظ منت اللہ صاحب نے پڑھائی۔

صلاح الدین تاج ایک کامیاب اور مقبول ڈرامہ نگار تھے، ان کے کئی ڈرامے ہندستان کی کئی ریاستوں میں اسٹیج ہوئے۔ ان کا پہلا ڈرامہ ۱۹۷۸ء میں 'اسپیشل گریڈ' کے عنوان سے اسٹیج ہوا جو کافی مقبول ہوا۔ یہ ڈرامہ اس وقت انھوں نے لکھا تھا جب گلی کارخانے میں 43 دنوں کی اسٹرائک ہوئی تھی۔ ان کے چند مشہور ڈراموں میں 'کتوں'، 'آدمی'، 'قبرستان کا اوپننگ' اور 'پاگلوں کا دربار' ہے جنھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مختلف اردو اکادمیوں نے ان کو کامیاب اور بہترین ڈرامہ نگار کے خطاب اور انعامات سے نوازا ہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، شاعر اور ناقد ڈاکٹر منصور عمر کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم پر قلب کا دورہ پڑا تھا جس سے وہ جاں بر نہ ہوسکے۔ ان کی تدفین ۲۳ اپریل ۲۰۱۴ء کی شب ان کے آبائی وطن دربھنگہ میں عمل میں آئی۔ وہ تقریباً ۶۰ برس کے تھے۔ ان کی درجن سے زیادہ ادبی و تنقیدی کتابیں ہیں جن میں 'اختر اورینوی۔ فنکار و ناقد'، 'چند نامور شعرائے بہار'، 'محروم کی شاعری'، 'اختر انصاری۔ حیات اور ادبی خدمات'، 'مابعد جدیدیت۔ ایک جائزہ' اور 'تنقیدی مقالات' وغیرہ کافی مقبول ہوئیں۔ انھیں شاعری میں بھی درک تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی شعری مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : کاروانِ قلم
مصنف : ڈاکٹر حسن الدین احمد
ضخامت : ۱۶۰ صفحات
قیمت : ۱۶۰ روپے
ملنے کا پتا : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
گلی عزیز الدین وکیل
کوچہ پنڈت، لال کنواں
دہلی 110006
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رضیہ حامد

ڈاکٹر حسن الدین احمد کی اردو میں مختلف موضوعات پر 23 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 24ویں ہے۔ اس کے علاوہ ۵ کتب انگریزی زبان میں تحریر کی ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہوکر قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرچکی ہیں۔

'کاروانِ قلم' کتاب میں 15 مضامین، 3 تقاریر اور مختلف کتابوں پر 6 تبصرے شامل ہیں۔ پہلا مضمون 'مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے نہج کی اہمیت اور آج کے عالمی تناظر میں اس کی معنویت' ہے جو کتاب کے 32 صفحات پر محیط ہے۔ اس کے علاوہ 'نثر میں نجیر کا پہنچ'، 'محمود فرخوی اور سونٹ'، 'انگریزی شاعری کے اردو منظوم ترجمے اور اس صنف کے اردو شاعری پر اثرات'، 'مسجد اکبری'، 'کاتب بمقابل کمپیوٹر کتابت' مضامین خاصے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے اکثر مضامین کسی نہ کسی سیمینار میں پڑھنے کے لیے لکھے گئے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں کی نظم 'واگر نامہ' جو انھوں نے 103 سال قبل کہی تھی، اس نظم میں تھوڑا سا تصرف کرکے ڈاکٹر صاحب نے اس کا عنوان 'سعودی نامہ' کردیا ہے۔ صاحب کتاب نے دونوں نظموں 'واگر نامہ' اور 'سعودی نامہ' کو آمنے سامنے صفحات پر شائع کیا ہے جس سے جدا جدا اشعار کا لطف آتا ہے۔ دونوں کا ایک ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

پڑی بھرتی ہے ننگے سر نظام الملک کی دولت
اک انگلو انڈین کے ہاتھ سے چادر اتروا کر
(ظفر علی خاں، واگر نامہ)

جو ننگے بھرتی ذلیل ہو کر بڑی بھرتی ہے ننگے سر
تو اس کے سر کی چادر پاتی ہے تیرے سر سعودی
(سعودی نامہ)

ڈاکٹر حسن الدین احمد نے انگریزی شاعری کے اردو منظوم ترجمے اور اس صنف کے اردو شاعری پر اثرات پر بہت تحقیق کے بعد قلم بند کیا ہے۔ انگریزی ادب اور اردو کی شاعری میں ترجمے کی تحریک وغیرہ عنوانات کے تحت اردو منظوم ترجمے پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اردو شاعری انگریزی سے کیے گئے منظوم ترجموں سے متاثر ہوئی، لکھتے ہیں:

"منظوم ترجموں کے ذریعے اردو شاعری انگریزی نظموں کے موضوعات سے متعارف ہوئی تو وہ ایک نئی جہت سے روشناس ہوئی... موضوعات نے محدود دائرے سے نکل کر تمام تر زندگی کا احاطہ کرلیا۔ اس طرح اردو شاعری کو ایک نیا میدان مل گیا۔ منظوم ترجموں سے نہ صرف شاعری کا دامن وسیع ہوا بلکہ تخلیق کی اپج کو بھی تقویت ملی۔" (ص ۸۳)

حسن الدین احمد نے ڈاکٹر ایم۔ نسیم اعظمی کی کتاب 'تعلیمی آلات اور حصول روزگار' سے متعلق کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کو وقت کی اہم ضرورت بتایا اور لکھا ہے۔ 'کاروانِ قلم' کا ہر مضمون اپنے موضوع کے حساب سے مبسوط ہے۔ تبصرے بھی خاصے کی چیز ہیں۔ خوب صورت ٹائٹل اور دیدہ زیب کتاب صاف ستھری طبع ہوئی ہے جسے لائبریریوں میں موجود ہونا چاہیے۔

●●●

نام کتاب : عصری تقاضے
(تنقیدی مضامین و تبصرے)
مصنف : دیپک بدکی
اشاعت : ۲۰۱۳ء
ضخامت : ۳۵۲ صفحات
قیمت : ۳۵۰ روپے
ناشر : میزان پبلشرز
بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز
ہیڈکوارٹرس، بٹہ مالو، سری نگر،
کشمیر-۱۹۰۰۰۹
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmail.com

دیپک بدکی اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کے قلم نے صرف افسانہ نگاری ہی میں نہیں بلکہ تنقیدی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، وہ ایک اعلا کتب شناس بھی ہیں۔ ان کے تبصرے صرف ایک تبصرے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھے جاتے ہیں۔ 'عصری تقاضے' انھی تبصروں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔

اردو میں تبصرہ نگاری کی کوئی مستحکم روایت نہیں ہے۔ انگلیوں پر ان لوگوں کے نام گنے جاسکتے ہیں جنھوں نے شعوری طور پر تبصرہ نگاری کے فن کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ظ۔ انصاری کی 'کتاب شناسی'، کلام مہدی کی 'ابلاغ'، شمس الرحمن فاروقی کی 'فاروقی تبصرے'، آل احمد سرور کی 'سرور کے تبصرے'، حلیم صبا نویدی کی 'کتاب سے کتاب شناسی تک'، کوثر مظہری کی 'بازدید اور تبصرے'، منصور امام قادری کی 'نئی پرانی کتابیں'، مظہر امام کی 'نگاہ طائرانہ' قابل ذکر ہیں۔ اس ضمن میں دیپک بدکی کی 'عصری تقاضے' ایک مستحسن کوشش ثابت ہوگی۔

'عصری تقاضے' کے شروع میں دس اہم تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں سے شروع کے دو مضامین میں اردو کے مسائل، حال اور مستقبل کے بارے میں بہت ہی تفصیل سے بحث کی گئی ہے، ہر جزوی مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور اس کا حل بھی پیش کیا گیا ہے اور اردو کی موجودہ صورت حال کے لیے ایک حد تک خود اردو والے طبقے کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔

دیپک بدکی کے مضامین میں تنقیدی نظر بہت اچھی پائی جاتی ہے۔ ناول ہو یا افسانہ، شاعری ہو یا بچوں کا ادب سب میں ان کی نظر کی داد دینی پڑتی ہے۔ ان کے مضامین میں موضوعاتی تنوع کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت دو چند ہوجاتی ہے۔ انھوں نے ہر صنف کی کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں، تحقیق و تنقید ہو یا شاعری، ناول و افسانہ ہو یا انشائیے اور خاکے، ڈرامے ہوں یا سوانح عمری، طنز و مزاح ہو یا شکار نامہ ہر ایک پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس کتاب میں شامل تبصروں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی رسمی اور سرسری نوعیت کے تبصرے نہیں ہیں بلکہ اکثر تبصرے ایسے ہیں کہ جس میں کتاب اور صاحب کتاب کے حوالے سے تسلی بخش بحث کی گئی ہے۔ کچھ تبصرے ایسے ہیں جو اپنی طوالت کی وجہ سے مضمون نظر آتے ہیں، جن میں 'فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا'، 'منٹو شناسی اور شکیل الرحمان'، 'زرد جھونکوں کی صدا'، 'خیال موسم لادوا اور خونخوار تیندوے' وغیرہ ہیں۔ ان میں ایک تجزیاتی مضمون کا عکس بھی نظر آتا ہے۔

دیپک بدکی کی تبصرہ نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے جس میں نہ ابہام ہے نہ اشکال البتہ کتاب کے حوالے سے وہ بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہیں اور نئے نئے گوشے بھی دریافت کرتے ہیں مثلاً محمد خالد عابدی کی کتاب 'نہرو، شخصیت اور اردو' پر تبصرہ کرتے ہوئے دیپک بدکی نے صاحب کتاب کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ "مولانا ابوالکلام آزاد نے نہ تو کسی قسم میں ہیرو کا رول ادا کیا ہے اور نہ انھوں نے کسی قسم کی ہدایت کاری کی اور نہ ہی وہ بھی فلم ساز رہے۔"

'عصری تقاضے' کے حرفِ آغاز میں دیپک بدکی نے اگرچہ فن تبصرہ نگاری کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے لیکن انھوں نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ "اردو میں نہ تو شاعروں کی کمی ہے اور نہ ہی نثر نگاروں کی، نہ داستانوں کی کمی ہے اور نہ ہی نقادوں کی اگر کمی ہے تو سنجیدہ قارئین کی اور غیر جانب دار نقادوں کی جو تنقید کو محض روزی روٹی کا وسیلہ یا گروہی نظریات کا اشتہار نہ سمجھ کر ادب کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"

اسی وجہ سے انھوں نے اس فن کو وہبی انداز میں برتا ہے اور فن تبصرہ نگاری میں اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔ ہر ایک تبصرے میں ان کا ایک اچھوتا انداز نظر آتا ہے۔ دیپک بدکی زبان و بیان کے حرکات و سکنات سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں ذہن پر بار نہیں ہوتیں، ان کی تحریروں میں زبان کا حسن بھی نظر آتا ہے اور بیان کی چاشنی بھی۔

دیپک بدکی کی اس کتاب میں ساٹھ تبصرے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب اچھی کتابوں کے متلاشی لوگوں کے لیے نشانِ راہ ثابت ہوگی اور علمی و ادبی حلقوں میں شرف قبولیت سے سرفراز ہوگی۔

●●●

بقیہ: علامہ اقبالؔ کا تصورِ تقدیر

صفحہ ۳ سے آگے

کہ وہ اس مقام بے نیازی اور درجہ استغنا پر آسانی سے نہیں پہنچتا۔ وہ ریاضت و مشقت کے بغیر مادی وجود کا باقی نہیں ہوسکتا اور اس کے تسلط سے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ اس مشقت و ریاضت میں استقامت کسی بڑے اصول سے سچی محبت کے بغیر ممکن نہیں اور پھر ہر اصول سے اونچا اصول لاالٰہ الا اللہ ہے۔ یہ قول حضرت علامہ:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں! لاالٰہ الا اللہ

مادی وجود کے تقاضے کسی بھی حیوان کے بنیادی تقاضوں سے کم طاقتور نہیں ہوتے۔ ہم ان تقاضوں کو جبلتیں کہہ لیتے ہیں۔ حضرت عبدالقادر بن عبداللہ السہروردی اپنی کتاب 'عوارف المعارف' (یہ کتاب شہاب الدین سہروردی کی عوارف المعارف سے پہلے کی ہے) میں لکھتے ہیں:

"فمن عرف اصول النفس و جبلاتها عرف ان لا قدرة له عليها الا باستعانة بارئها و فاطرها. فلا يستحق العبد بالانسانية الا بعد ان يدبر دواعي الحيوانية فيه بالعلم و العدل وهو رعاية طرفي الافراط و التفريط، ثم بذالك تتقوى الانسانية و معناه"۳۳

یعنی "جو انسان نفس کے مزاج اور اصل سے آگاہ ہے اور اس کی جبلتوں کو پہچانتا ہے، اس کو معلوم ہے کہ وہ نفس اور اس کی جبلتوں پر اس وقت تک قابو نہیں پاسکتا، جب تک وہ ان کے خالق اور موجد فطرت سے استعانت نہ کرے۔ اور کوئی بندہ بھی جب تک اپنے وجود کے حیوانی تقاضوں سے علم و عدل کے ساتھ نپٹ نہیں لیتا انسانیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور علم و عدل کی اس کارروائی کا مطلب ہے کہ افراط و تفریط پر کڑی نگاہ رکھی جائے، جبھی جاکر اس کی انسانیت اور معنویت تقویت یاب ہوتی ہے"۔

(باقی آئندہ)

●●●

بقیہ: کبیر احمد جائسی کی یاد میں

صفحہ ۲ سے آگے

اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، خدا کرے آپ اچھے ہوں اور خوش بھی۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

یہ خط اشاعت کے لیے نہیں ہے۔

(۹)

علی گڑھ

۱۵ر جولائی ۲۰۰۳ء

الیاس صاحب سلام مسنون

لفافہ ملا۔ شکریہ

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

مولانا سے دست بستہ عرض کر دیں کہ میری کتاب "ڈھونڈو گے انھیں" پر ارشاد میں کوئی تبصرہ شائع نہ کروائیں۔ ازحد شکر گزار ہوں گا۔

امید ہے مولانا کی صحت معمول کے مطابق ہوگی، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین

مئی کے بعد سے ارشاد کا کوئی شمارہ نہیں ملا۔ شائع نہیں ہوا یا ڈاک میں ضائع ہوا؟!

امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

آخری خط کا پس منظر یہ ہے کہ پروفیسر جائسی نے اپنے تذکروں کا مجموعہ ''ڈھونڈو گے انھیں'' انھیں راحت حقانی کے طویل تبصرے کے ساتھ بغرض اشاعت بھیجا تھا۔ حضرت الاستاذ نے کہا کہ یہ تبصرہ طویل ہے، اس لیے شائع نہیں ہو سکتا اور یہ بات میں جائسی صاحب کو دیرینہ تعلق کی بنا پر لکھ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے تم ان کو لکھو کہ تبصرہ طویل ہے اس لیے دوسرا تبصرہ شائع ہوگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جائسی صاحب ناراض ہوں گے اور ہوا بھی یہی۔ انھیں خط لکھا گیا اور وہ ناراض ہوئے اور اس کے جواب میں مذکورہ خط لکھا۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد پھر ان کا لب ولہجہ مشفقانہ ہو گیا ہے گویا انھیں اصل بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد ایک اور واقعہ پیش آ گیا جس سے وہ مجھ سے سخت ناراض ہوئے جو کئی سالوں ناراض رہے۔

۲۰۰۳ء میں بمبئی میں مولانا عبد السلام ندوی کی سمینار منعقد ہوا جس میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔ اس سمینار میں پروفیسر جائسی صاحب کے مقالے کا عنوان 'مولانا عبد السلام ندوی کی سات غیر مطبوعہ کتابیں' تھا جس کو انھوں نے بڑی محنت سے لکھا تھا اور بڑے اہتمام سے پیش کیا تھا البتہ اخیر میں انھوں نے اس وقت کے دار المصنفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی کو مخاطب کر کے کہا کہ اب ضیاء الدین صاحب بتائیں کہ وہ مسودات کہاں گئے؟

میں نے ضیاء الدین صاحب کے دفاع میں جائسی صاحب سے کہا کہ یہ ان سے پوچھنے کا سوال نہیں ہے کیوں کہ وہ تو بہت بعد میں دار المصنفین کے ناظم ہوئے یہ سوال تو آپ کو ان سے پہلے کے نظما سے کرنا چاہیے تھا۔ غالباً یہ بات جائسی صاحب کو کبیدہ کر گئی اور ان کی ناراضگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس زمانے میں میرے علی گڑھ کے بعض دوستوں نے بتایا کہ جائسی صاحب سے جب ملاقات ہوتی ہے وہ پوچھتے ہیں کہ تمہارے دوست ڈاکٹر الیاس کا مبلغ علم کیا ہے۔ مجھے ان کے اس رویے سے شدید تکلیف پہنچی مگر ان کی شفقتوں کو یاد کر کے خیال ہوا کہ یہ وقتی معاملہ ہے۔

۲۰۰۸ء میں مولانا عبد السلام ندوی کے بھتیجے اور پیکر شرافت مولانا عبد الحسیب اصلاحی صاحب نے مولانا سعید انصاری کے چند خطوط مجھے عنایت کیے۔ مولانا سعید انصاری دار المصنفین کے قدیم رفیق، علامہ شبلی اور مولانا عبد السلام ندوی کے بڑے عقیدت کیش تھے اخیر عمر میں انھوں نے حیات عبد السلام لکھی تھی جو لاہور میں ان کی وفات کے بعد نہ معلوم کیا ہوئی۔ ان کے مذکورہ خطوط اسی زمانہ تصنیف کے تھے چنانچہ میں نے ایک نوٹ کے ساتھ انھیں ماہنامہ 'معارف' میں شائع کرا دیا ان خطوط میں بعض لوگوں پر کچھ تنقیدیں تھیں اس میں ایک آدھ کا تعلق پروفیسر جائسی سے بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی اشاعت سے جائسی صاحب مجھ سے اور برہم ہو جائیں گے، مگر ایسا نہ ہوا بلکہ بڑا ہی شفقت کا معاملہ فرمایا البتہ ان خطوط کے عکس مانگے جو انھیں فراہم کرا دیے گئے۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد نہ معلوم کیوں ان کی شفقتوں میں اضافہ ہو گیا۔ اکثر فون کرتے اور کبھی کبھار میں بھی کر لیا کرتا۔ بڑی محبت فرماتے اور وقتاً فوقتاً کچھ مشورہ دیتے۔ میری کتاب 'شبلی سخنوروں کی نظر میں' شائع ہوئی تو بڑی تحسین فرمائی اور برابر دعائیں دیتے رہے۔ دسمبر ۲۰۱۲ء میں علامہ شبلی کے نادر خطوط کا مجموعہ 'مکتوبات شبلی' میرے حواشی کے ساتھ شائع ہوا اور ان کی خدمت میں بھیجا تو بہت خوش ہوئے اور خاص طور پر میرے حواشی کی بہت تحسین فرمائی۔ دسمبر کے اواخر میں فون کر کے کہا کہ تم میرا ایک کام یہ کر دو کہ مولانا عبد السلام ندوی نے 'تاریخ الفقہ' کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس کا مسودہ دار المصنفین میں موجود ہے اس کو کئی قسطوں میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے ادھر ادھر کر کے 'معارف' میں شائع کیا ہے۔ دونوں کو ملا کر مرتب کر دو اور ایک مقدمہ لکھ کر میرے پاس فوراً بھیج دو چنانچہ میں نے مطبوعہ مضامین کی کاپی کرائی اور ارادہ تھا کہ دار المصنفین جا کر مسودہ سے ملانوں کا ابھی یہ کام کر بھی نہ سکا تھا کہ ۵ر جنوری کو ان کا یاددہانی کا فون آ گیا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ میری کتابوں پر 'معارف' میں چھپے دو تبصروں کی ضرورت ہے انھیں کاپی کرا کے بھیج دو چنانچہ میں نے اپنے دوست ڈاکٹر جمشید احمد ندوی سے کہا کہ یہ دونوں تبصرے جائسی صاحب کو بھیجنے ہیں انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کیا بھیجیں گے میں یہیں سے کاپی کرا کے انھیں دے دیتا ہوں۔ جس دن وہ دینے والے تھے اسی دن ۱۷ر جنوری ۲۰۱۳ء جائسی صاحب نے رخت سفر باندھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

افسوس کہ 'تاریخ الفقہ' کی ترتیب وتدوین کا کام میں اب تک نہ کر سکا، خدا اس کے کرنے کی توفیق بخشے۔

•••

بقیہ: نسل پرستی اور دیگر حیوانی...

صفحہ ۸ سے آگے

پولیس تھانے گئی، وہاں ایک سپاہی موجود تھا جس کے کان میں پنسل کا ایک ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ اس کے انداز واطوار سے ایسی تجاہلانہ بے نیازی مترشح تھی، جیسے دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا واقعہ اس کے لیے حیرت واستعجاب کا محرک نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کے گوش گزار کیا کہ میرے اوپر ایک مہیب بھیڑ ہجوم نے تشدد وحملہ کیا تھا۔

''مسٹر موب یا مسز موب؟'' اس سپاہی نے کمال بے نیازی سے اپنی بھدی ہندی میں سوال کیا۔ تب مجھے ایک انوکھا احساس ہوا کہ شاید میں اپنی حد پار کر کے ایک نئے علاقے میں داخل ہو گئی تھی، جہاں مجھے نہیں جانا چاہیے تھا۔

تبھی تھانے میں ایک نوجوان کو لایا گیا۔ میں جہاں بیٹھی تھی، اس سے کوئی گز بھر دور ایک سپاہی نے اس نوجوان کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اس نے اس پر گھونسوں کی بوچھار کر دی۔ جب وہ بے چارہ پٹتے پٹتے لڑکھڑا کر گر جاتا تو سپاہی اسے کھینچ کر اٹھا لیتا اور پھر مارتا۔ میں یہ سب برداشت نہ کر سکی اور باہر نکل آئی۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

بعد ازاں جب مشہور فلم ساز و صحافی خواجہ احمد عباس نے اس واقعے کے بارے میں سنا تو انھوں نے ایک عوامی شکایتی نامہ لکھا اور اسے شائع کروایا۔ انھیں یہ بخوبی علم تھا کہ میں نے قرآن پاک کے ہندی ترجمے کا مطالعہ کیا ہے، نیز میں صوفیانہ مزاج کی مالک تھی، اس لیے، میں کسی بھی مذہب کی توہین کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی۔ اگلے ہفتے جب ان کا مقبول کالم (آزاد قلم) ہفتہ وار 'بلٹز' میں چھپا تو اس کا عنوان تھا ''لیلا ہمیں معاف کرو'' (مذہب کا ایک رخ وہ تھا اور ایک رخ یہ تھا۔ خیر سے دونوں ہی مسلمان تھے)۔

اب میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں کہ انسانیت کا چہرہ ہمیشہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ جنیوا جہاں مجھ پر نسلی حملہ ہوا تھا اس شہر میں مجھے اپنی بہترین سہیلی ملی۔ وہ تھی کیتھرین لیپارڈو، جو بعد میں کیتھرین گین لیپارڈو بن گئی۔ تب میں لیلا نائیڈو تھی۔ اب میں لیلا نائیڈو مورلیس ہوں۔ ہماری دوستی گزشتہ ستاون برس سے قائم ہے۔ ہم پہلی بار لڑکپن میں ملے تھے۔ اس کے بعد جب ہم دونوں پچاس کے لپیٹے میں تھے، تو ہم نے ایک ساتھ جنوبی ہندوستان کی سیاحت کی۔ کہا جاتا ہے کہ ہم سفری دوستی کے لیے سم قاتل ثابت ہوتی ہے، لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک دن کیتھرین نے کھڑکی سے لٹک کر خالصتاً کسی اسکولی طالبہ کے جوش وخروش کے ساتھ چیخ کر کہا تھا ''لیلا، لیلا، دیکھو یہاں کی گائیں زرد رنگ کی ہیں''۔ اور درحقیقت ایسا ہی تھا۔ دراصل کیرالہ میں برس کے ایک خاص دن گھر میں پلی سفید گائے کو ہلدی کا لیپ لگا کر غسل دیا جاتا ہے، جس سے گائے کا رنگ عموماً اس دن کے لیے زرد ہو جاتا ہے۔ اس دن ہم دونوں مل کر بہت کھل کر ہنسے تھے، جیسے ہم دونوں ایک بار پھر اسکولی لڑکیاں ہو گئی ہوں۔ مشہور کومیں دن چاکلیٹ چوس رہی ہوں۔ ڈبل روٹی کھا رہی ہوں۔ پھر ہم ایک خوش نما فطری منظر سے گزرے تھے، جسے ہم نے اپنی آنکھوں میں بسا لیا تھا۔

نوٹ: مندرجہ بالا مضمون اپنے وقتوں کی نامور خاتون لیلا نائیڈو کا ہے۔ یہ ایک باب ان کی انگریزی خودنوشت "Leela Naidu: A Patch work life" سے لیا گیا ہے۔ لیلا نائیڈو کو Vogue میگزین نے دنیا کی پانچ خوب صورت ترین خواتین میں ایک قرار دیا تھا۔ وہ ایسی خاتون تھیں جنھوں نے چار بار راج کپور کی فلم کا کنٹریکٹ سائن کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ Jean Renoir نے انھیں اداکاری کے گر سکھائے تھے اور Salvador Dali نے Madonna کے لیے ان کی خدمات ماڈل کے طور پر حاصل کی تھیں۔ ابھی وہ بیس برس کی عمر کو بھی نہیں پہنچی تھیں کہ ان کی شادی مشہور اوبرائے خاندان میں ہوئی جس کی ہوٹل انڈسٹری پر اجارہ داری تھی۔ وہ دو جڑواں بچوں کی ماں بھی بن گئیں مگر شوہر کی بدمزاجی کے سبب یہ شادی دو تین برس ہی میں ٹوٹ گئی بعد میں وہ ہندوستان کے انگریزی کے مقبول شاعر Dom Moraes کی زندگی میں جمالیات کی ایک دیوی اور ایک وفادار بیوی کے طور پر داخل ہوئیں جو اس کی بااختیار سکریٹری بھی تھیں اور بہترین دوست بھی۔ وہ بہت سے Magazines کی ایڈیٹر رہیں اور ہانگ کانگ کی ایکشن فلمیں بھی ڈب کرتی رہیں۔

لیلا نائیڈو ہندوستانی سائنس داں ڈاکٹر رمنا نائیڈو اور ایک فرانسیسی خاتون صحافی کی بیٹی تھیں۔ لیلا نائیڈو اس دنیا میں پلی بڑھی تھیں جو طرح طرح کے لوگوں کے واقعات سے بھری ہوئی تھی۔ رشی کیش مکرجی کی فلم 'انورادھا' ہے جس کی نمائش برلن فلم فیسٹیول میں ہوئی تھی، لیلا نائیڈو کے فلمی کیریئر کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد مرچنٹ آئیوری کی فلم 'دی ہاؤس ہولڈر'، پردیپ کرشن کی فلم 'الیکٹرک مون' اور شیام بینیگل کی فلم 'تریکال' میں جلوہ گر ہوئیں۔ لیلا نائیڈو نے خود اپنی بھی شارٹ فلمیں اور ڈاکومنٹریز بنائیں۔ بالآخر ۲۰۰۹ء میں ان کی بے وقت موت کے ساتھ ان کا یہ حسین سفر حیات تمام ہوا۔ (ادارہ)

•••

نسل پرستی اور دیگر حیوانی خصوصیات

لیلا نائیڈو

چوتھی اور آخری قسط

لیلا نائیڈو کی انگریزی خودنوشت Leela Naidu: A Patchwork Life کے ایک باب سے

انگریزی سے ترجمہ: مظفر حسین سید
(29/11- سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی110002)
Email: syedmh92@yahoo.com

سابقہ مذہبی عصبیت سے

ہندستان میں قیام کے دوران ایک دن میرا سابقہ مذہبی عصبیت سے پڑا۔ اس مرتبہ مقابلہ ایسے راسخ العقیدہ مذہب پرستوں سے تھا جو اپنے مسلک کی پیروی محض خارجی سطح پر کرتے ہیں، نیز خود اپنے مذہب کی اصل روح یعنی بنیادی اصولوں کو سرے سے نظر انداز کردیتے ہیں۔ اس ضمن میں دینی ماہرین خواہ کچھ فرمائیں اور امام، پجاری اور پادری کوئی بھی رائے رکھیں لیکن اس بنیادی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تمام مذاہب کے بنیادی ارکان ہمیں بھی یاد دلاتے ہیں کہ انسانیت کی اقدار مشترک کو تسلیم کرنا ہی ہمارا فرض اولین ہے اور اسی ضابطے کے تحت تمام انسانوں کا احترام بھی ہم پر واجب ہے۔

یہ اپریل ۱۹۸۳ء کی بات ہے، جمعے کا دن تھا اور بڑی شدید گرمی تھی۔ میں بمبئی میں الٹا ماؤنٹ نام کی ایک عمارت میں قیام پذیر تھی اور سڑک کے اس پار ٹھیک سامنے ایک عمارت کے گیراج میں ایک مسجد تھی، جہاں جمعے کی نماز ہوتی تھی۔ ہر جمعے کو نماز کے وقت سڑک پر آمد و رفت بند کردی جاتی تھی، کیوں کہ جگہ کی کمی کے باعث نمازیوں کی بڑی تعداد سر راہ اپنے فرض کی ادائیگی کرنے کے لیے مجبور تھی۔ ایسا ہر جمعے کو ہوتا تھا لیکن وہ جمعہ میرے لیے غیر مسعود تھا۔ اس لیے کہ اس دن مجھے اپنے والد محترم کو عارضۂ قلب سے روبہ صحت ہونے کے بعد ہاسپٹل سے گھر واپس لانا تھا۔ ڈوم نے میرے ساتھ چلنے کی پیش کش کی تھی۔ میں آج تک یہ طے کرپانے سے قاصر ہوں کہ اس کا وہ جذبۂ ہمدردی محض حسن اتفاق تھا یا اسے کسی انہونی کا ادراک ہوگیا تھا۔

اسپتال روانگی سے قبل میں نیچے گئی اور سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کرنے والے ذمے دار نوجوانوں سے ملی اور انھیں صراحتاً بتایا کہ ایک معمر مریض کو اسپتال سے گھر واپس لانے کے لیے جارہی ہوں اور مجھے ٹیکسی اپنی عمارت کے دروازے تک لے جانی پڑے گی کیوں کہ علالت سے اٹھے وہ بزرگ چند قدم چلنے کی بھی تاب نہیں رکھتے۔ ان نوجوانوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ پوری سڑک پر رکاوٹیں کھڑی نہیں کریں گے اور مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

اسپتال لوٹتے وقت ڈوم ٹیکسی کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا اور میں والد صاحب کے ساتھ پچھلی نشست پر۔ جب ہم اپنی منزل تک پہنچے تو وہاں سڑک تین چوتھائی سے زیادہ بند تھی اور ٹیکسی یا کار کے نکلنے کی قطعاً گنجائش نہیں بچی تھی۔ میں ٹیکسی سے اتری اور راستے میں حائل رکاوٹ تک گئی، مگر اس وقت تک نماز شروع ہوچکی تھی، لہٰذا میں انتظار کرنے لگی۔ گرمی دوپہری کی تھی اور سورج اپنی بھرپور تمازت ہمارے سروں پر برسا رہا تھا۔ نماز ختم ہونے کے بعد میں نے رکاوٹ کے قریب کھڑے اشخاص سے پوچھا کہ کیا میں ٹیکسی اندر لاسکتی ہوں۔ میں نے ان کے سامنے وضاحت بھی کی کہ میرے ساتھ ایک بزرگ ہیں جو علیل اور ضعیف ہیں۔ لیکن ان سبھی نے میری بات کو ان سنا کردیا، شاید ان کی نظر میں میرا وجود کسی لال بیگ (کاکروچ) سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے اور قرآن کریم انسانی ہمدردی اور مہر و عنایت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ مقدس صحیفۂ آسمانی ہمیں زندگی کے آداب و احترام کا درس دیتا ہے۔ قرآنی احکام ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دیتے کہ بزرگوں اور ضعیفوں سے صرف نظر کی جائے۔ مجھے اپنے اندر غیظ و غضب کا ایک طوفان اٹھتا محسوس ہوا۔ مجھے لگا کہ یہ لوگ عبادت گزار نہیں۔ اگر وہ ایک معمر شخص کی حاجت اور مجبوری سے چشم پوشی کرسکتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے سے کہیں بڑی قوت کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھ رہے ہیں۔

آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو میں نے ان لوگوں سے کہا کہ کیا تم اس بات کا خیال کرکے کہ سڑک بند ہے کچھ دیر کے لیے اپنی نماز روک سکتے ہو؟ میرا اتنا کہہ دینا انھیں مشتعل کردینے کے لیے کیوں کافی تھا یہ مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ دو قوی ہیکل افراد جو روایتی لنگیوں میں ملبوس تھے، میری جانب جھپٹے۔ ان میں سے ایک نے براہ راست میری آنکھوں میں تھوک دیا اور طمانچے کے ایک [illegible] نے میری بصارت کو زائل کردیا۔ اس کے بعد ان دونوں نے مل کر مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور ایک نے میرے سر پر وار کیا اور دوسرے نے میرے گردوں کو نشانہ بنایا اور مکے ہی مکے رسید کیے۔ اسی دوران چند دوسرے لوگ ہماری ٹیکسی پر حملہ آور ہوگئے۔ وہ ٹیکسی پر چڑھ گئے اور اس کی چھت کو زور زور سے پیٹنے لگے۔ ان کی آوازوں میں جوش اور طیش تھا اور وہ ٹیکسی کو نذر آتش کرنے کی دھمکی دے رہے تھے کہ اس کے اندر جو بھی ہے اسے جان سے مار ڈالیں گے۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی میں چابی لگی چھوڑ کر موقعے سے فرار ہوچکا تھا۔

میں نہیں جانتی کہ میں اس جانکاہ حادثے سے کس طور عہدہ برآ ہوسکی تھی، لیکن نصرت غیبی پہنچی۔ سامنے ہی میٹر ڈیوا اسٹریٹ پر مسز لوسیا گورنگ کا گھر تھا اور وہ اپنی کھڑکی سے اس بھیانک تماشے کو بہ آسانی دیکھ سکتی تھیں۔ وہ صورت حال کو پوری طرح جانچنے کے لیے بالکنی میں آگئیں۔ پوری بات سمجھ میں آتے ہی انھوں نے اپنے بیٹے کو پولیس بلانے کے لیے روانہ کردیا۔ اس نوجوان نے جیسے ہی سیاہ رنگ کی ایک جیپ میں ایک ٹریفک پولیس افسر کو دیکھا، وہ اسے موقعے پر لے آیا۔ ہمارے اوپر حملہ آور بہادر وردی کی ایک جھلک دیکھتے ہی اڑن چھو ہونے لگے، جب کہ چند لمحے قبل وہ ایک کمزور عورت کو زد و کوب کررہے تھے اور ایک ضعیف شخص کو دہشت زدہ کررہے تھے۔ اس فرض شناس پولیس افسر نے ٹیکسی کو عمارت تک پہنچوایا اور اس کے بعد اس نیکوکار نے دوسری منزل تک پہنچنے میں بھی ہماری مدد کی۔ اس نے بڑی ترکیب سے فٹ بال کے کھیل میں استعمال ہونے والی بنچ کے سہارے میرے والد کو بڑے آرام سے ان کی خواب گاہ تک پہنچا دیا۔

ماحول ابھی تک گرمایا ہوا تھا اور فضا میں تشدد آمیز دھمکیاں گونج رہی تھیں، ابھی ایک بلند آواز سنائی دی۔ "بوڑھے تو کہیں نہیں جاتے، مگر اس عورت کو سنبھل کر ہر قدم رکھنا ہوگا"۔ پھر ایک دوسری آواز آئی "ہم پوری عمارت کو آگ کے حوالے کردیں گے"۔ پھر ایک دھمکی سنائی دی "اس عورت کا شوہر کہاں ہے، اسے تو ہم قتل کر ہی دیں گے"۔ پھر چاقو کھلنے کی تیز کرخت اور کاٹ دار آواز سنائی دی۔

میں نے اپنے والد کو آرام سے لٹا دیا اور ڈوم کو بھی۔ اسے بھی بری طرح زد و کوب کیا گیا تھا۔ کئی لوگوں نے اپنے جوتوں سے اس کے منہ پر وار کیے تھے۔ یہ تشدد کی ایک ایسی قسم تھی جس کا اثر جسمانی سے کہیں زیادہ نفسیاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے ڈوم کا چشمہ بھی توڑ دیا تھا۔

اس کے بعد مسز گورنگ اور ڈاکٹر نوین کمار ہم سے ملنے آئے۔ وہ دونوں کولابہ کے اس علاقے میں خاصے سرگرم تھے۔ میں سخت اذیت میں مبتلا تھی، مگر میرے پاس آنسو بہانے کے لیے وقت نہیں تھا۔

"آپ کو پولیس میں شکایت درج کرانی چاہیے"، مسز گورنگ نے مشورہ دیا۔ پھر میں ان دونوں کے ساتھ

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: قمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۹۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org